ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.3 (2025)
(July to September)

نصیر احمد ناصر کی نظموں میں تصورِ امن

The Concept of Peace in Naseer Ahmed Nasir's Poetry

ڈاکٹر صائمہ اقبال

پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلوشپ، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

ڈین، کلیہ علوم شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Dr. Saima Iqbal
Post-Doctoral Fellowship, Faculty of Oriental Learning, University of the Punjab, Lahore
drsaimaiqbal@gcuf.edu.pk
Prof. Dr. Muhammad Kamran
Dean, Faculty of Oriental Learning, University of the Punjab, Lahore

Abstract:
Dr. Naseer Ahmed Nasir is a leading contemporary modern poet whose works beautifully and sensitively present human values, international harmony, and especially the concept of peace. In his poems, amid borders, wars, and power conflicts, he places human beings and humanity at the center of attention. This is why his poetic style is not only intellectually mature, but also gives new literary meaning to themes such as peace, love, and mutual respect. His poems reflect both the inner and outer worlds of human experience. He portrays the fears, restlessness, and longing for peace within the human heart, while also depicting the oppression, wars, and unrest occurring in the world. The complexity in his poetry does not arise from difficult ideas, but from the gravity of the issues he chooses to explore. His poetry contains love and beauty, yet it also holds a deep awareness of social conditions and the lack of peace - qualities that strongly connect his work to the theme of peace in the modern age.

Keywords: Human values, Concept of peace, harmony, humanity, conflict, restlessness, oppression, social conditions

آج کا انسان پہلے کے انسانوں کی طرح سیدھا اور سادہ نہیں رہا، بلکہ بہت الجھا ہوا اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ ایک طرف سیاسی اور سماجی مسائل سے متاثر ہے اور دوسری طرف نئے سائنسی نظریات اور بدلتی ہوئی دنیا اسے مسلسل سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان نئی باتوں نے پرانے روحانی اور فلسفیانہ خیالات کو بھی بدل دیا ہے اور بہت سی باتیں جو پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب زیادہ واضح ہو گئی ہیں۔ اس مسلسل تبدیلی نے ادب کو بھی متاثر کیا ہے، جس کی وجہ سے شاعری اور افسانے میں نئے موضوعات اور نئی سوچ سامنے آئی ہے۔ نصیر احمد ناصر بھی انہی شاعروں میں سے ہیں جو اس بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل، احساسات اور فکری کشمکش کو اپنی نظموں میں گہرے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر عصری جدید نظم کے نمائندہ شاعر ہیں جن کے ہاں انسانی قدروں، بین

الاقوامی ہم آہنگی اور خصوصاً تصورِ امن کو نہایت حساس اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں سرحدوں، جنگوں، اور طاقت کے تصادم کے بیچ انسان اور انسانیت کو مرکزِ نگاہ بنایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا شعری اسلوب نہ صرف فکری طور پر پختہ ہے بلکہ امن، محبت اور باہمی احترام جیسے موضوعات بھی کو ادبی سطح پر نئی معنویت بخشتا ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ایک ایسے شاعر ہیں جن کی نظموں میں اندرونی اور بیرونی دونوں دنیا کے مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انسان کے دل کے خوف، بے چینی اور امن کی خواہش کو بھی بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی دنیا میں ہونے والے ظلم، جنگ اور بے سکونی کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان کی مشکل بات سوچ کی پیچیدگی نہیں بلکہ ان مسائل کی سنگینی ہے جنہیں وہ سمجھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت اور خوبصورتی بھی ہے، مگر ساتھ ہی معاشرتی حالات اور امن کی کمی کا احساس بھی موجود ہے، جو ان کی نظموں کو آج کے دور کے امن کے موضوع سے خاص طور پر جوڑ دیتا ہے۔ تصور امن کے حوالے سے ان کی نظم "پسپائی اور محبت کی آخری تعمیر" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم جدید عہد کی انسانیت، محبت اور امن کے زوال کی ایک علامتی دستاویز ہے۔ شاعر نے انتہائی اثر انگیز اور تصویری انداز میں ایک ایسی دنیا پیش کی ہے جو جنگ، مشینیت اور بے حسی کے بوجھ تلے دب چکی ہے۔ نظم میں انسانی احساسات، فطرت، اور رشتوں کے بکھر جانے کا المیہ بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے۔ شاعر کا لہجہ درد، شکست اور بے بسی سے لبریز ہے، لیکن اس کے پس منظر میں امن، محبت اور انسانی ربط کی گہری آرزو پوشیدہ ہے۔

"جب کشتیاں دریاؤں سے
اور کنارے پانیوں سے ادب جائیں
اور راستے بستیوں کے نواح سے گزرتے ہوئے
اچانک کسی ہائی وے کی زد میں آ کر کچلے جائیں
تو سمجھ جانا
زمین پر میرے اور محبت کے دن پورے ہو چکے ہیں
اور میں آخری معرکہ بھی ہار چکا ہوں

اور عین جنگاہ میں
تمہارے لیے لکھی ہوئی نظمیں
اور امن خوابوں سے بھری ہوئی ڈائریاں
ان درختوں کے ساتھ ہی کوئلہ بن چکی ہیں
جو شعالی حملے سے پہلے
پھولوں سے لدے ہوئے تھے
محبت کا مرنا آخری نشانی ہے!!" (۱)

نظم کے آخر میں شاعر کا یہ جملہ "محبت کا مرنا انسانی ادوار میں آخری نشانی ہے" نظم کا مرکزی خیال اور فکری نچوڑ ہے۔ یہ بیان صرف فرد کی نہیں بلکہ پوری تہذیب کی شکست کا استعارہ ہے۔ شاعر کے نزدیک محبت ہی زندگی اور امن کا سرچشمہ ہے، اور جب

یہ ختم ہو جائے تو دنیا ویران، انسان مشینی، اور زمین بے روح ہو جاتی ہے۔ نظم میں موجود تباہی، جلتے درخت، اور برباد بستیوں کے استعارے دراصل امن کے خاتمے اور محبت کی غیر موجودگی کی علامت ہیں۔ یوں یہ نظم ایک نوحہ بھی ہے اور ایک تنبیہ بھی کہ محبت کا زوال دراصل انسانیت کے انجام کی نشانی ہے۔ ان کی نظم "دکھ گوتم سے بڑا ہے" جدید عہد کے انسان کے دکھ، بے حسی اور جنگ زدہ دنیا میں بکھرتی انسانیت کا نوحہ ہے۔ شاعر نے اس تخلیق میں "گوتم بدھ" کی علامت کے ذریعے امن، سکون اور روحانی نجات کے اُس خواب کو یاد کیا ہے جو کبھی انسانیت کا مقدس ہدف تھا۔ لیکن آج کا انسان، جو نفرت، تشدد اور خود غرضی میں ڈوبا ہوا ہے، اُس خواب سے بہت دور جا چکا ہے۔ یہ نظم دراصل امن کے کھو جانے اور انسانی ضمیر کے مرنے کی علامتی تصویر پیش کرتی ہے، جس میں شاعر یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جب دکھ اجتماعی ہو جائیں تو امن ایک خواب بن جاتا ہے۔

"وہ، کپل وستو کا شہزادہ
دو پہیوں پر چلتی بیل گاڑی
اور گاڑی وان کو دکھ سمجھتا رہا
اور بڑھاپے، بیماری اور موت پر
قابو پانے کی کوشش کرتا رہا
لیکن اتنا نہ جان سکا کہ گیان دھیان انچاس دنوں کا نہیں
ساری عمر پر محیط ہوتا ہے
اور عرفان و آگہی کا دریا
حقیقی زندگی کے کناروں سے پھوٹتا ہے
گوتم نے غزہ نہیں دیکھا
وہ عراق، افغانستان اور شام نہیں گیا
اس نے تو کراچی اور کوئٹہ بھی نہیں دیکھے
بوری بند لاشیں
اور خودکش دھماکوں میں اُڑتے ہوئے
انسانی اعضا نہیں دیکھے

افریقہ میں دودھ سے عاری ڈھلکی ہوئی سیاہ رنگ چھاتیاں
اور مرتے ہوئے آبنوسی ڈھانچے نہیں دیکھے
گوتم نے عظیم جنگیں
اور آبدوزوں میں مرنے والوں کی آبی قبریں نہیں دیکھیں" (۲)

یہ نظم امن کی تلاش کی ناکامی پر ایک گہرا طنز ہے۔ شاعر کے نزدیک آج کا انسان اپنی فکری، سیاسی اور سماجی زوال میں اس قدر الجھ چکا ہے کہ اب وہ گوتم کی طرح دکھ سے نجات نہیں چاہتا بلکہ دکھ کے ساتھ جینا سیکھ گیا ہے۔ دنیا بھر میں پھیلی جنگیں، معاشی

ناہمواری اور انسانیت کا قتل شاعر کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہیں کہ محبت، رحم اور امن کے تصورات صرف کتابی الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔ جب انسان احساسِ درد کھو دیتا ہے، تو امن مر جاتا ہے اور یہی جدید دور کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ نصیر احمد ناصر کی نظم "آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو" انسانیت، محبت اور امن کے زوال پر ایک گہرا احتجاج ہے۔ شاعر نے دنیا میں بڑھتی ہوئی سرحدوں، پابندیوں اور جنگوں کے ذریعے یہ دکھایا ہے کہ انسان نے خود اپنی آزادی اور فطرت کی ہم آہنگی کو قید کر لیا ہے۔ بارش، ہوا، بادل اور پہاڑ جیسے قدرتی عناصر بھی انسان کی بنائی ہوئی سرحدوں کے اسیر بن گئے ہیں۔ یہ منظر نامہ امن کی غیر موجودگی اور انسان کی خود غرضی کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کو اس بات کا دکھ ہے کہ دنیا تباہی کی طرف جا رہی ہے، اور وہ اسے صرف بے بسی سے دیکھ سکتا ہے۔

"----------

کتنی عجیب بات ہے
کہ زیادہ تر نظمیں اور کہانیاں
دلوں اور سرحدوں کے آس پاس
کسی قومیت کے بغیر جنم لیتی ہیں
اور سرحدیں پار کرتے ہوئے
غیر قانونی داخلی یا جاسوسی کے الزام میں دھر لی جاتی ہیں
ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے
بارش اور ہوا کو بھی ویزے سے استثنا حاصل نہیں
جنگل کے پھول بھی
پرمٹ کے بغیر اپنی خوشبو برآمد نہیں کر سکتے
پہاڑوں کی چوٹیاں
آمنے سامنے ہونے کے باوجود
ایک دوسری سے گلے نہیں مل سکتیں
سرحدوں کے طرفین
اجازت ناموں کے لیے
بادل لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں
کسی دور افتادہ ستارے پر رہنے والوں کے لیے
یہ دنیا پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی
لیکن ہم اسے تباہ ہوتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہے ہیں
اور لکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے
سچ ہے کہ شاعری دنیا کا نظام نہیں بدل سکتی

یہ کیسی جنگ ہے؟
بم کہیں اور گرتے ہیں
اور دھمک ہمارے دلوں تک آتی ہے
دیواریں کہیں اور ہلتی ہیں
اور شیشے ہماری کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہیں
کہیں دور کسی قلم سے خون رستا ہے
اور یہاں ہماری نظمیں رونے لگتی ہیں

اے دنیا بھر کے شاعرو!
آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو"(۳)

نظم کے اختتام میں شاعر امن کی ایک آخری امید کی بات کرتا ہے۔ وہ دنیا کے تمام شاعروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "آخری لفظ کے بے کار ہونے تک لکھتے رہو"، یعنی جب تک زندگی باقی ہے، انسان کو قلم کے ذریعے ظلم، جنگ اور نفرت کے خلاف آواز بلند کرتے رہنا چاہیے۔ یہاں شاعری کو امن کے فروغ کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ نظم کا مرکزی پیغام یہی ہے کہ اگرچہ دنیا میں تباہی عام ہے، مگر امن کی تلاش اور انسان دوستی کی جدوجہد قلم اور لفظ کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہنی چاہیے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی نظم "محبت اصلی مشین گن نہیں چلا سکتی" محبت کو امن کی علامت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ شاعر نے محبت کو ایک غیر عسکری اور زندگی بخش قوت کے طور پر دکھایا ہے، جو جنگ، نفرت اور تباہی کے مقابلے میں ہمیشہ نرمی، شفقت اور ہم آہنگی کا پیغام دیتی ہے۔ نظم میں محبت کو بادل، ہوا، درخت، پھول اور تتلیوں جیسے فطری عناصر کے ساتھ جوڑ کر اس کی آزادانہ، ہمہ گیر اور بے ضرر فطرت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ شاعر کے نزدیک محبت انسانی زندگی اور امن کی آخری پناہ گاہ ہے، جو کسی بھی طاقت یا ظلم سے ختم نہیں ہو سکتی۔

"محبت بادلوں کی طرح آسمان سے برستی ہے
اور پانی کی طرح زمین پر بہتی ہے
اور ہوا کی طرح
درختوں کے پتوں کو چھیڑتی،
چہروں کو چھوتی ہوئی
کبھی نہ ختم ہونے والے راستوں ناراستوں پر
بے پا افشار چلتی رہتی ہے
محبت نفرت کا اینٹی سیرم ہے
کبھی نہ ایکسپائر ہونے والی ویکسین ہے
جو جسموں کی دبیز ترین تہوں سے گزر جاتی ہے
زمین محبت کی آخری پناہ گاہ ہے

یہاں اسے کوئی نہیں مار سکتا
تمام تر نفرتوں کے باوجود
محبت اصل مشین گن نہیں چلا سکتی
یہاں وہ جنگلوں، پہاڑوں، ندیوں، کھیتوں
اور کھیتوں میں کام کرنے والے
مردوں اور عورتوں کا روپ دھار لیتی ہے
پھولوں کے رنگوں
اور تتلیوں کے پروں میں کیمو فلاژ ہو جاتی ہے
اور کبھی کبھی تو شرارتی بچوں کی طرح
شہد کی مکھیوں
اور بھڑوں کے چھتوں میں جا گھستی ہے
اور کبھی زیادہ غصے میں ہو
تو معصوم کیڑوں مکوڑوں کو پاؤں تلے مسل ڈالتی ہے
یا چیونٹیوں کے سوراخوں میں پانی بھر دیتی ہے
یا کھلونا مشین گن سے
نقلی فائرنگ کرتے ہوئے تڑتڑ ہنستی ہے
محبت اس سے زیادہ کسی ذی حس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی
انسانوں سے تو وہ تا دیر ناراض بھی نہیں رہ سکتی
سوائے دہشت گردوں کے
جن کے قریب جانے سے وہ ڈرتی ہے
کیونکہ محبت اصلی مشین گن نہیں چلا سکتی؟" (۴)

نظم کے آخر میں شاعر یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ محبت کبھی انسان کو نقصان نہیں پہنچاتی، سوائے ان کے جو دہشت اور نفرت کے راستے پر ہیں۔ اس میں امن کا پیغام یہ ہے کہ اگر انسان محبت کو سمجھ لے تو جنگ اور دہشت گردی کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ محبت کو یہاں ایک غیر عسکری مگر طاقتور قوت کے طور پر دکھایا گیا ہے، جو دنیا کو جوڑ سکتی ہے۔ اس طرح پوری نظم امن، انسانیت اور محبت کے دیرپا رشتے کی علامت ہے۔ اس طرح ان کی نظم "دنیا آب و گل کے ذخیروں میں بٹی ہوئی ہے" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سری نگر روڈ محض ایک شاہراہ نہیں بلکہ امن اور سکون کی ایک علامتی راہ ہے، جو ازل اور ابد کے درمیان لہراتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ راہ دل سے شروع ہو کر صدیوں اور زمانوں کے سنگ میل طے کرتی ہے، اور وقت کی سرحدی چوکیوں سے گزرتی ہوئی انسانی رشتوں، محبت اور ہم آہنگی کے منطقے تک پہنچتی ہے۔ دل، جس میں امن کے کئی جہلم اور نیلم بہتے ہیں، اس پر یہ نظم ہمیں یاد دلاتی ہے

کہ امن کا سفر صرف زمین کے راستوں تک محدود نہیں بلکہ انسانی شعور، احساسات اور تعلقات کے اندر بہتا ہوا ایک دائمی دریا ہے۔ یہ شاہراہ ایک فکری اور روحانی امن کی علامت ہے، جو انسانی دلوں میں محبت اور ہم آہنگی کے بیج بونا سکھاتی ہے۔

"یامین! سرحد کے اُس پار سے آنے والے یادلوں کی کلانچیں
اور بارش کے چھینٹے بتا رہے ہیں کہ دشمن نے پانیوں کی جنگ جیت لی ہے خوشبوؤں، گیتوں اور کہانیوں کو روک لگ چکی ہے
اور نظم مٹی اور کنکریٹ کے پشتوں کے سامنے بے بس پانی کی طرح ڈھیر ہوتی جا رہی ہے
اور جہلم اب ایک بل کھاتی پتلی ریت کی لکیر کے سوا کچھ نہیں
یامین! دل کے مرتفع سلسلوں سے نکلتی ہوئی ایک بے نام سڑک میری طرف بھی آتی ہے جس پر کوئی سنگ میل نصب نہیں
کوئی چیک پوسٹ، کوئی ناکا نہیں
جس کے سنگ
کوئی جہلم، کوئی نیلم نہیں
بس محبت کی ایک دکھائی نہ دینے والی کاریز ہے!"(۵)

یہ منظر امن کی تلاش میں انسانی جدوجہد اور بے بسی کی عکاسی کرتا ہے۔ دنیا کے آب و گل کے ذخیروں، بارش کے چھینٹوں اور دلوں کی کلانچوں کے ذریعے شاعر یہ دکھاتا ہے کہ جنگ اور نفرت نے قدرت اور انسانی رشتوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ خوشبوؤں، گیتوں اور کہانیوں پر روک کے باوجود، محبت ایک خاموش مگر موجود کاریز کی طرح بہتی رہتی ہے۔ وہ بے نام سڑک جو مرتفع سلسلوں سے نکل کر شاعر تک پہنچتی ہے، امن کی علامت ہے۔ "چلنے کے لیے سب سے اچھا راستہ دل کا ہے"۔ شہزاد نیر کو مخاطب کرتی یہ نظم انسان اور فطرت کے رشتے، زمین کے بگاڑ اور انسانی احساسات کی سرد مہری کا علامتی بیان ہے۔ شاعر نے خاک اور آب کے قدیم تعلق کو امن اور توازن کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، مگر اس کے مقابل "مٹی اور برف" کے کمزور رشتے کے ذریعے انسانوں کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری اور غیر محسوس دشمنی کو واضح کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں زمین، برف، آگ اور وقت کے حوالے سے جو تصویری پیکر پیش کیے گئے ہیں، وہ دراصل اس بات کا اشارہ ہیں کہ انسان نے فطرت اور اپنے وجود دونوں کے ساتھ امن کا رشتہ توڑ دیا ہے۔ اس فکری تمہید کے بعد شاعر دنیا کے بگڑتے ماحول، جنگوں، آلودگی اور انسانی بے حسی کو دکھاتا ہے، جو نظم کے اگلے حصے میں تصورِ امن کے مرکزی پیغام کی بنیاد بنتی ہے۔

"شہزاد نیر! یہ آئس ایج کا نہیں گلوبل وارمنگ کا زمانہ ہے
زہریلے مادوں کی بارش ہو رہی ہے
اور زمین پر آلودگی بہہ رہی ہے
آسمان دھول اور دھویں کے بادلوں سے بھرا ہوا ہے
اوزون کی چھتری جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہے
گلیشیئر پگھل رہے ہیں
اور سمندر ساحلوں سے اونچے ہو رہے ہیں
زیرِ ارض ذرا سی جنبش پر سونامی بن جاتے ہیں

اور ہنستی کھیلتی جزیروں اور جنگلوں جیسی سبز و شاداب زندگی
لاشوں کے صحرا میں تبدیل ہو جاتی ہے"(۶)

یہ بند امنِ عالم کے ماحولیاتی پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر نے بتایا ہے کہ زمین کی بقا خطرے میں ہے، اور جب فطرت کا توازن بگڑتا ہے تو انسان کا امن بھی تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ بند ماحولیاتی امن کی نمائندگی کرتا ہے۔

"شہزادنیر! جہاں تم ہو
وہاں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں
فرق یہ ہے کہ تم برف کے لباس میں ہو
اور بھاری بوٹوں اور رشتوں کے ساتھ چلتے ہو
اور اگلو میں بیٹھ کر موت کا مذاق اڑاتے ہو
جبکہ ہم سادہ تن
کاغذی ہتھیار اور لفظی گولہ بارود اٹھائے رضاکار شہریوں کی طرح برسرِ پیکار ہیں"(۷)

یہ بند فکری اور انسانی جدوجہد کا استعارہ ہے۔ شاعر نے امن کے لیے لڑنے والے قلمکاروں اور فنکاروں کو دکھایا ہے جو لفظوں سے جنگ کرتے ہیں، تشدد سے نہیں۔ جہاں شاعر یہ باور کراتا ہے کہ امن کا حقیقی سرچشمہ باہر نہیں، بلکہ انسان کے دل کے اندر ہے۔ ظاہری جنگوں اور شور کے بیچ، دل ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسانوں کو جوڑتا اور محبت کے تسلسل کو زندہ رکھتا ہے۔ اسی احساس کے ساتھ نظم اپنے تیسرے بند میں روحانی امن اور انسانی وابستگی کے پیغام تک پہنچتی ہے۔ نظم "پانی میں گم خواب" جدید دنیا میں طاقت، سائنس، اور جنگ کے بے قابو استعمال سے پیدا ہونے والی تباہی اور امن کے زوال کا گہرا شعری بیان ہے۔ نظم کے آغاز میں شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایٹمی دور میں انسانیت احساس کھو چکی ہے۔ اب انسانوں کے "نام" نہیں بلکہ "کوڈ" یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ علامت اس غیر انسانی دور کی عکاسی کرتی ہے جہاں انسان کی قدر کم اور طاقت و ہتھیاروں کی اہمیت زیادہ ہو گئی ہے۔ ایٹمی دھماکوں سے تباہ ہوتی نسلیں، بکھرتے شہر اور ٹوٹے خواب امن کے برباد ہونے کی تصویریں ہیں۔ شاعر کا کہنا ہے کہ اس تباہی کے رقص میں زمین و سورج تو باقی رہ جاتے ہیں مگر خدا، جو امن، محبت اور زندگی کی علامت ہے، کہیں نظر نہیں آتا۔

"ننھے منے بچوں کے
نو بہار ہاتھوں میں
پھول کون دیکھے گا
آنے والی صدیوں میں
تیری میری آنکھوں کے
خواب کون دیکھے گا
زیرِ آب چیزوں کا
کچھ پتا نہیں ہوتا!"(۸)

یہ بند امن کے زوال اور مستقبل کے خوفناک منظر کو بیان کرتا ہے۔ شاعر یہاں معصوم بچوں کے ہاتھوں میں پھول جو امن، محبت اور زندگی کی علامت ہیں، کے مٹ جانے کا دکھ بیان کرتا ہے۔ یہ بند ایک گہرا سوال اٹھاتا ہے، اگر جنگ، تباہی اور ایٹمی جنون جاری رہا، تو آنے والی نسلیں نہ خواب دیکھ سکیں گی، نہ محبت محسوس کر سکیں گی، یعنی امن ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے گا۔ نظم "دھند کے پار" ایک انتہائی دردناک اور طاقتور تصورِ امن کی ضد کو پیش کرتی ہے۔ اس میں شاعر نے جنگ، تباہی، انسانی المیے اور تہذیبی بربادی کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جو امن کی اہمیت کو شدت سے اجاگر کرتی ہیں۔ یہ نظم دراصل امن کے غائب ہونے کی کہانی ہے، جہاں "فائرنگ"، "دھماکے"، "زخمی"، "جلتے خیمے"، "تصویر کی آنکھوں میں آنسو" اور "لہو سے بھرے اوراق" وہ علامتیں ہیں جو انسان کی خود اپنی بنائی ہوئی بربادی کی گواہ بن گئی ہیں۔

"فائرنگ، زخمی، دھماکے سائرن
شعلے
دھوئیں کے آبنوسی دائرے
جلتے تناظر
آگ میں لپٹی کتابیں
لائبریری کی عمارت
میوزیم
تصویر کی آنکھوں میں آنسو
سلسلہ در سلسلہ سہمی ہوئی
اطراف میں
اعضا بریدہ زندگی
سرگشتگی افکار کی غارت گری الفاظ کی
تازہ لہو تاریخ کے اوراق پر... "(۹)

یہ بند دراصل امن کے بکھرنے کی سب سے شدید علامت ہے۔ یہاں شاعر نے دکھایا ہے کہ جب جنگ چھا جاتی ہے تو علم (کتابیں، لائبریری)، فن (میوزیم، تصویریں)، اور انسانیت (آنکھوں کے آنسو) سب راکھ بن جاتے ہیں۔ یوں یہ بند امن کے قیمتی ہونے اور اس کے غائب ہونے کے المیے کو نمایاں کرتا ہے — اور اسی کے ذریعے نظم امن کی گہری معنویت کو اجاگر کرتی ہے۔ نظم "آگ سے مکالمہ" تصورِ امن کی ایک دلگداز علامت ہے۔ شاعر نے اس میں جنگ اور تباہی کے مناظر کے ذریعے امن کی غیر موجودگی کو انتہائی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ کون سے بند یا حصے امن کے تصور کو براہِ راست ظاہر کرتے ہیں تو وہ یہ ہے:

"مجھے سفر پر روانہ ہونے کی دو اجازت!
کہ شاخِ زیتون جل رہی ہے
زمیں چناروں کے سرخ پتوں سے بھر گئی ہے"!!(۱۰)

یہ بند امن کے بکھرنے اور اس کی علامتوں کے جل جانے کی تصویر ہے۔ "شاخِ زیتون" جو ہمیشہ سے امن، امید اور دوستی کی علامت سمجھی جاتی ہے، کا جل جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا سے انسانیت، برداشت اور سکون کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ شاعر گویا امن کے لیے تڑپتا ہے، لیکن ہر طرف جنگ، خون اور تباہی دیکھ کر وہ "سفر پر روانہ ہونے کی اجازت" مانگتا ہے۔ یہ سفر دراصل ایک نئے، پر امن جہاں کی جستجو ہے۔ یوں پوری نظم میں شاعر کا مکالمہ آگ سے نہیں بلکہ جنگ کی آگ سے بھاگنے اور امن کی تلاش کا مکالمہ ہے۔ "اگر مجھے مرنا پڑا" یہ نظم شدتِ احساس، انسانیت کے درد اور امن کی گہری آرزو سے لبریز ہے۔ شاعر نے اسے محض ایک احتجاج یا شکوے کے طور پر نہیں بلکہ انسانی ضمیر کی پکار کے طور پر پیش کیا ہے۔ نظم کے آغاز میں شاعر موت کے امکان کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک زندہ سوال بن جاتا ہے۔ ایسا سوال جو دنیا بھر میں جاری ظلم، نسل کشی، اور بے گناہوں کے قتل پر خاموش رہنے والوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، عراق اور افغانستان کی مثالیں دے کر شاعر ظلم کی سرحدوں کو مٹا دیتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ درد کی کوئی قومیت نہیں، ظلم کا کوئی مذہب نہیں، اور امن کی کوئی سرحد نہیں۔

"لیکن یہ ضرور پوچھوں گا
کہ فلسطین سے کشمیر تک
بوسنیا سے چیچنیا تک
اور عراق سے افغانستان تک
لاکھوں بے گناہوں کو
اور اُن بچوں کو
جو ابھی ماؤں کے شکموں میں تھے
کس ضابطہ موت کے تحت مارا گیا؟
کیا ان کی موت کو مشیت ایزدی سمجھا جائے؟
کیا واقعی وہ اسی طرح مرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے؟
کیا محبت اور موت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟
اور کیا پیدا ہوئے بغیر بھی مرا جا سکتا ہے؟"(۱۱)

یہ بند دراصل اس سوچ کی نمائندگی کرتا ہے کہ انسانی جان کی حرمت مذہب، قوم یا سرحد سے بالاتر ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ دنیا ان سوالوں پر غور کرے اور یہ سمجھے کہ امن صرف تب ممکن ہے جب نفرت، تعصب اور طاقت کے نام پر کی جانے والی تباہی ختم ہو۔ اس بند میں امن کے لیے ایک اخلاقی اور انسانی اپیل پوشیدہ ہے جو پوری نظم کے جذباتی پس منظر کو متعین کرتی ہے۔ نظم کے دوسرے بند میں شاعر اپنے پہلے بند کے سوالات کو مزید گہرائی دیتا ہے اور انسانی ضمیر کی عدالت میں جنگ اور تشدد کے خلاف مقدمہ پیش کرتا ہے۔

"مجھے امید ہے
کہ میرے ان سوالوں کو
اتنا معصوم اور سادہ نہیں سمجھا جائے گا

میں جانتا ہوں
ان کا جواب کسی کے پاس نہیں
مارنے والوں کے پاس بھی نہیں
پھر بھی میں اور کسی سے نہیں تو موت سے ضرور پوچھوں گا
کہ ان جنے بچوں کو
کسی خدائی قانون کی رو سے رحم بدر کیا گیا
اور بارودی سرنگیں
کس فرشتے کی ایجاد ہیں اور وہ جنت کیسی ہو گی جو خودکش دھماکوں کے بدلے میں ملتی ہے
اور کیا جہنم کے لیے
آسمان پر کوئی جگہ نہیں بچی تھی؟
اگر مجھے مرنا پڑا
تو میں بچوں سے باتیں کرتے ہوئے مرنا پسند کروں گا
اور اگر موت کو کہیں اور جانے کی جلدی نہ ہوئی
تو اسے ڈھیر ساری نظمیں سناؤں گا
شاید اُس کا دل پسیج جائے
اور وہ اُس روز
میرے علاوہ
باقی مرنے والوں کی جان لینا ملتوی کر دے
اور کراچی اور کوئٹہ جانا بھول جائے" (۱۲)

اس بند میں شاعر کی امید اور انسان دوستی نمایاں ہے۔ یہاں شاعر کی تخلیق اور فن کے ذریعے امن کی کوشش نظر آتی ہے۔ وہ بندوق کے مقابلے میں لفظ کو، اور نفرت کے مقابلے میں محبت اور احساس کو ہتھیار بناتا ہے۔ یوں یہ بند امن کے فلسفے کو گہرائی سے بیان کرتا ہے۔ "کبوتروں کے پاس کوئی خواب نہیں" یہ مختصر مگر معنی خیز نظم امن کے کھوکھلے تصورات پر گہرا طنز کرتی ہے۔ شاعر نے "کبوتروں" کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ وہی کبوتر جو عموماً امن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہاں شاعر بتاتا ہے کہ ان کبوتروں کے پاس کوئی خواب نہیں، کوئی شعور نہیں۔ وہ صرف علامت بن کر رہ گئے ہیں، حقیقت میں امن کے لیے کچھ کر نہیں سکتے۔

"وہ محض امن کی علامت ہیں
اور ڈربوں کی قید میں
بلی کے خوف سے
آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں؟" (۱۳)

ڈربوں کی قید اور بلی کے خوف کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آج کا امن خوف اور جبر کے سائے میں قید ہے۔ انسانیت کے دل میں جو آزادی اور خواب دیکھنے کی صلاحیت تھی، وہ سہم کر رہ گئی ہے۔ شاعر دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ محض علامتوں سے نہیں، بلکہ عمل، شعور اور حوصلے سے حقیقی امن قائم ہوتا ہے۔ ''تھنک ٹینک'' یہ نظم طاقتور طبقوں اور عالمی طاقتوں کے ریا کارانہ امن کے دعووں پر طنز کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہی لوگ، جو دنیا میں جنگ، تباہی اور ظلم کے ذمہ دار ہیں، بعد میں امن کے حل سوچنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ یہ دراصل اس منافقت کی نشاندہی ہے جو عالمی سیاست میں امن کے نام پر کی جاتی ہے۔

''وہ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں
اور حل سوچتے ہیں
دنیا میں
خود پیدا کردہ مسائل کا!''(۱۴)

شاعر کے نزدیک یہ لوگ مسائل کے حل تلاش نہیں کرتے بلکہ اپنے پیدا کردہ زخموں پر ظاہری مرہم رکھتے ہیں تاکہ دنیا کو دھوکا دیا جا سکے۔ دراصل شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایسا مصنوعی اور دکھاوے کا امن حقیقی امن نہیں ہوتا۔ جب تک ظلم، لالچ اور طاقت کی ہوس باقی ہے، اس وقت تک دنیا میں پائیدار اور حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ شاعر اس نظم کے ذریعے ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ امن صرف نعروں یا اجلاسوں سے نہیں بلکہ انصاف، برابری اور انسانی ہمدردی سے پیدا ہوتا ہے۔

''فاتح دشمن سامنے نغمہ جاں گزا''

اس نظم میں شاعر نے پھول، خواب، اور گیت جو محبت، امید، اور زندگی کی علامتیں ہیں کو اشجار (درختوں)، دیواروں، اور تلواروں پر لکھنے کی بات کی ہے۔ یہ علامتی انداز دراصل جنگ و جدال کے مقابلے میں امن، خوبصورتی اور انسان دوستی کا پیغام دیتا ہے۔

''یہاں کچھ پھول میرے ہیں
انھیں اشجار پر لکھ دو!
یہاں کچھ خواب میرے ہیں
انھیں دیوار پر لکھ دو!
یہاں کچھ گیت میرے ہیں
انھیں تلوار پر لکھ دو!
یہاں کچھ لوگ میرے ہیں
انھیں بھی دار پر لکھ دو!''(۱۵)

نظم میں شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اگر دنیا میں تلواریں اور دیواریں قائم ہیں، تو ان پر بھی محبت اور انسانیت کے نقوش کندہ کیے جائیں تاکہ نفرت اور تباہی کے درمیان بھی زندگی اور امن کی خوشبو برقرار رہے۔ ڈاکٹر نصیر کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتا ہے کہ شاعر نے امن کو انسانیت کی بقا اور تخلیقِ کائنات کا بنیادی تقاضا قرار دیا ہے۔ ان کے ہاں جنگ، نفرت، تعصب اور طاقت کے نشے کے مقابلے میں محبت، ہمدردی، برداشت اور انصاف کو اصل قوت تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ جب تک دنیا سے ظلم، استحصال اور خود غرضی ختم نہیں ہوتی، تب تک حقیقی امن ممکن نہیں۔ شاعر اپنے کلام کے ذریعے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ امن کوئی وقتی نعرہ نہیں، بلکہ ایک طرزِ احساس اور طرزِ زندگی ہے، جو صرف انسان کی سوچ، عمل اور محبت سے ممکن بن سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نصیر احمد ناصرؔ، ڈاکٹر، سر مئی نیند کی بازگشت،، جہلم، بک کارنر، ۲۰۱۷ء ص:۲۸۔۲۹

۲۔ ایضاً، ص:۵۲۔۵۳

۳۔ ایضاً، ص:۱۱۴۔۱۱۵

۴۔ ایضاً، ص:۱۲۲۔۱۲۳

۵۔ ایضاً، ص:۲۰۵

۶۔ ایضاً، ص:۲۳۱۔۲۳۳

۷۔ ایضاً، ص:۲۳۱۔۲۳۳

۸۔ ایضاً، ص:۲۷

۹۔ نصیر احمد ناصرؔ، ڈاکٹر، پانی میں گم خواب، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۳ء ص:۱۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۴۳

۱۱۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، تیسرے قدم کا خمیازہ، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۳ء، ص:۵۰

۱۲۔ ایضاً، ص:۵۰۔۵۲

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۵۰

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۶۲

۱۵۔ ایضاً، ص:۳۲

References in Roman Script:

1. Naseer Ahmad Nasir, Doctor, Sar Maee Neend Ki Baaz Gasht, Jhelum, Book Corner, 2017, p. 28–29
2. Ibid., p. 52–53
3. Ibid., p. 114–115
4. Ibid., p. 122–123
5. Ibid., p. 205
6. Ibid., p. 231–233

7. Ibid
8. Ibid., p. 27
9. Naseer Ahmad Nasir, Doctor, Pani Mein Gum Khawab, Lahore, Saanjh Publications, Ishaat-e-Dom, 2013, p. 138
10. Ibid., p. 143
11. Naseer Ahmad Nasir, Doctor, Teesray Qadam Ka Khumiyaza, Lahore, Saanjh Publications, Ishaat-e-Dom, 2013, p. 50
12. Ibid., p. 50–52
13. Ibid., p. 150
14. Ibid., p. 162
15. Ibid., p. 32